Volume 03, Issue 04,
October-December 2025
PP: 36-45
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

سفر نامہ ''یورپ یورپ ہے'' میں یورپی معاشرت کی ادبی تشکیل

The Literary Formation of European Society in the Travelogue "Europe is Europe"

Jaweria Nadeem[1], Dr. Muhammad Riaz Abid[2]

Article History

Received
03-12-2025

Accepted
26-12-2025

Published
30-12-2025

Abstract & Indexing

Abstract

Travelogues have long occupied a significant place in understanding the social structure, history, and culture of different regions. In his travelogue Europe Is Europe, Yaqoob Nizami presents European society, history, and civilization with clarity and literary elegance, rendering the work valuable for both general readers and scholars of travel literature. During his travels across Italy, France, Belgium, Germany, and Switzerland, the author not only documents historic monuments, cities, streets, lakes, and castles but also offers keen observations of social behavior, human values, and moral attitudes. This travelogue transcends the conventional boundaries of travel writing and emerges as a reflective and analytical account of European culture and society. Through his close engagement with everyday life, Yaqoob Nizami enables readers to experience European social realities, historical consciousness, and civilizational patterns from an intimate perspective. The narrative carefully examines local lifestyles, architectural aesthetics, social norms, and religious traditions, providing a nuanced portrayal of European society. A central argument advanced in the travelogue is that the true essence of civilization does not rest solely on material advancement or technological progress. Rather, it is rooted in human character, social responsibility, moral discipline, and a collective sense of justice. By emphasizing these values, Europe Is Europe offers a critical reflection on modern civilization and invites readers to reassess commonly held assumptions about progress and development. The travelogue thus stands as an insightful contribution to contemporary Urdu travel literature and cultural discourse.

Keywords:

European Civilization, Travelogue, Yaqoob Nizami, Cultural Observation, Social Behavior, Ethics, Historical Cities, Architectural Styles.

[1] *MPhil Scholar, Department of Urdu & Iqbal Studies, The Islamia University of Bahawalpur.*
[2] *Assistant Professor, Department of Urdu & Iqbal Studies, The Islamia University of Bahawalpur.*
riaz.abid@iub.edu.pk

All Rights Reserved © 2025 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

سفر روزاول سے ہی انسان کا مقدر رہا ہے۔ کسی چیز کو جاننے کی خواہش انسانی فطرت میں داخل ہے۔ تلاش و جستجو جبلّی قوت ہے جو انسانی نسل کو تہذیب و تمدن کا ارتقائی سفر جاری رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ فطرت انسانی ہے کہ انسان کو ماحول کی یکسانیت سے اُکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے اور یہی اُکتاہٹ اسے ماحول کی کو تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر آمادہ سفر ہو جاتا ہے اور نئے نئے مقامات کی سیر و سیاحت کو نکل جاتا ہے۔ نئے ممالک کی تاریخ اور جغرافیہ اور اقوام عالم کے اخلاق و عادات، رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی خواہش بھی ایسی خواہش ہے جو انسان کو سفر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

کسی بھی سفر کی ابتداء اور انتہا حیرت سے ہوتی ہے۔ جب نامعلوم اور ان دیکھے راستوں کے سفر کی روداد سامنے آئے تو وہ دراصل حیرتوں کے شہر میں داخل ہو جاتا ہے۔ تاریخوں اور تہذیبوں کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ انسان جب محض فرد کی حیثیت سے جینے کے بجائے سماجی زندگی کی طرف مائل ہوا تو رفتہ رفتہ معاشرے وجود میں آئے اور انہی معاشروں سے تہذیبوں نے جنم لیا۔ مختلف تہذیبوں کو سمجھنے اور ان کے باہمی ربط کو جانچنے کے لیے سفر ہمیشہ ایک بنیادی وسیلہ رہا ہے۔ جب انسان ایک خطے سے دوسرے خطے تک پہنچا تو وہاں کے رہن سہن، رسوم، اقدار اور طرزِ فکر نے اسے متاثر کیا اور وہ اثرات واپس آکر اس کی اپنی سوسائٹی کا حصہ بن گئے۔ یوں ایک معاشرہ دوسرے معاشرے سے جڑتا چلا گیا اور تہذیبیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر وسعت اختیار کرتی رہیں۔ اس پورے عمل میں سفر نامہ محض ذاتی تجربے کا بیان نہیں رہا بلکہ تہذیبوں کے تعارف، فہم اور پھیلاؤ کا ایک مؤثر ذریعہ بن گیا۔ سفر نامہ نگاری کی یہ خوبی ہے کہ وہ تاریخ کے اوراق کو بآسانی پڑھوا سکتا ہے۔ دلچسپی کے مناظر اس میں پیش کرتا ہے اور تاریخی جگہوں کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود پڑھنے والا خود اس تہذیب کا حصہ بن جاتا ہے۔

دنیا کے نقشے پر چند خطے ایسے ہیں جنہوں نے تاریخ، تہذیب، علم اور فن کے میدانوں میں ایسے اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں کہ زمانے گزرنے کے باوجود ان کی روشنی مدہم نہیں ہوتی۔ یورپ انہی خطوں میں سے ایک خطہ ہے جہاں اِنسانی شعور، سائنسی ایجادات، فکری بیداری اور تہذیبی اِرتقاء کی کہانیاں قدم قدم پر بکھری پڑی ہیں۔

یورپ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ایک ایسا منظر نامہ دکھائی دیتا ہے جہاں وقت کے ساتھ ساتھ سلطنتیں بنتی اور بکھرتی رہیں۔ مذاہب اور زبانیں آپس میں اُلجھتی اور نکھرتی گئیں اور انسانیت نے تہذیب و تمدن کے کئی نئے پہلو دریافت کیے۔ یہی وہ خطہ ہے جس نے قرونِ وسطیٰ کے تاریخی دور سے نکل کر جدید جمہوری اِقدار اور اِنسانی حقوق کے تصور کو عملی جامہ پہنایا۔

یورپ محض ایک براعظم نہیں بلکہ اقوامِ عالم کے لیے ایک تہذیبی مدرسہ ہے جس سے مختلف ادوار میں سیکھنے کے لیے بے شمار مواقع ملے۔ اس براعظم کی مٹی میں افلاطون و ارسطو کی فکر پنپی اور آئن سٹائن اور نیوٹن کی سائنس نے بھی اس سرزمین پر آنکھ کھولی۔ یورپ سے ہی نشاطِ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں کے میوزیم، لائبریریاں، یونیورسٹیاں اور فن پارے آج بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس خطے نے انسان کی فکری ترقی کو کس قدر اہمیت دی۔ آج کا یورپ علم اور دولت کا گہوارہ ہے۔ یورپی دولت کی چمک دمک سے غریب دنیا کے باشندوں کی جب آنکھیں چکاچوند ہوتی ہیں تو ان کے دِلوں میں خواہشات کروٹیں لینے لگتی ہیں کہ کاش ہم بھی یورپ کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔

جس طرح برصغیر ایک طویل عرصے تک یورپی سیاحوں کے لیے ایک پراسرار اور دلکش سرزمین سمجھا جاتا رہا اور بے شمار یورپی اس خطے کو دیکھنے کے شوق میں یہاں آئے۔ اسی طرح یورپ بھی برصغیر پاک و ہند کے باشندوں کے لیے ہمیشہ ایک کشش رکھتا رہا۔ اس کشش نے کئی لوگوں کو یورپ کے سفر پر آمادہ کیا تاکہ وہ اس خطے کی تہذیب، تاریخ اور سماجی ساخت کو قریب سے دیکھ سکیں۔ یعقوب نظامی کا تعلق اگرچہ برصغیر سے ہے لیکن وہ ایک طویل عرصے سے یورپ میں مقیم ہیں۔ یورپ کی فطری خوبصورتی، تہذیبی تنوع اور تاریخی گہرائی نے انہیں بھی گہرے طور پر متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یورپ کے مختلف ممالک کا سفر کیا اور ان مشاہدات کو اپنے سفر ناموں میں نہایت سلیقے، روانی اور فکری گہرائی کے

ساتھ قلم بند کیا۔ جو قاری کو محض سفر کی روداد نہیں بلکہ ایک تہذیبی تجربہ فراہم کرتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ان ممالک کی سیر کی بلکہ مشاہدات کو ایک حساس قلم کی چھلنے سے چھان کر ایک ایسا سفر نامہ تخلیق کیا جو صرف ایک سیاح کی رُوداد نہیں بلکہ ایک باشعور محقق کی تہذیبی و فکری گفتگو اور تاریخ پر گہری نظر ہے۔ اٹلی، فرانس، بیلجیم، جرمنی اور سوئزرلینڈ کی سفری یادوں پر مشتمل سفر نامہ ''یورپ یورپ ہے'' کے نام اکتوبر 2012ء کو منظر عام پر آیا۔

سفر نامہ معلومات کا نگار خانہ ہے۔ جس میں یورپی ممالک کی آب وہوا، جنگلات، پہاڑ، پیداوار وہاں کی آبادی کے عقائد، خیالات اور ان کی سماجی زندگی کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ مصنف نے یورپ کی ترقی اور کامرانی کو سراہنے کے علاوہ اس کی معاشرتی خامیوں پر بھی کڑی تنقید کی ہے۔

یورپ کا سفر صرف جغرافیائی طور پر سرحدوں کا عبور نہیں بلکہ تہذیبوں، معاشرتی روایات اور تاریخی نشانات کے درمیان ایک علمی و تحقیقی مطالعہ بھی ہے۔ یعقوب نظامی کا سفر نامہ ''یورپ یورپ ہے'' اس حقیقت کو بخوبی اُجاگر کرتا ہے، کیونکہ اس میں مختلف یورپی ممالک کے قدیم و جدید پہلوؤں کا تجزیہ نہایت مشاہداتی انداز میں کیا گیا ہے۔ اس آرٹیکل میں اٹلی، فرانس، بیلجیم، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے اہم شہر اور ان کی تہذیبی، تاریخی اور معاشرتی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں اور ساتھ ہی بعض مقامات پر قرآنی حوالہ جات کے ذریعے انسانی معاشرت میں عدل، انصاف اور اخلاقی رویوں کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

مصنف نے اٹلی کے مختلف علاقوں کی سفری داستان بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ اٹلی یورپ کے جنوبی حصے میں واقع ایک ایسا ملک ہے جو تہذیب، فن، فلسفہ، ادب، فنِ تعمیر، مصوری، موسیقی، مجسمہ سازی اور مذہب کے حسین امتزاج سے آراستہ ہے۔ یہ سرزمین ہزاروں سال سے انسانی تمدن کا گہوارہ رہی ہے۔ اٹلی کی تاریخ قدیم رومی سلطنت سے لے کر نشاۃ ثانیہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں سے مغربی دنیا نے علم، فن اور سائنس میں نئی روح پائی۔ اس ملک کی گلیوں میں ماضی کی سرگوشیاں گونجتی ہیں اور ہر شہر اپنے دامن میں تاریخ کے انمٹ نقوش سمیٹے ہوئے ہے۔ اٹلی کی زبان، خوراک، طرزِ رہائش، رسوم و رواج اور فنی روایات دنیا بھر میں نہ صرف معروف ہیں بلکہ دلوں کو چھو لینے والی گہرائی رکھتی ہیں۔ یہاں کی فضائیں فنکاروں، مفکروں، سائنس دانوں اور مذہبی پیشواؤں کی عظمتوں کی گواہ ہیں۔ اٹلی کو یورپ کی تہذیبی روح کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

میلان سے ویرونا کی جانب بڑھتا ہے تو دریاؤں اور پلوں کا منظر اس کے لیے ایک فطری مگر تہذیبی پل بن جاتا ہے۔ پلوں پر چلتے ہوئے اسے یوں لگتا ہے کہ یہ شہر ماضی اور حال کو ملانے والا ہے۔ رومیو جولیٹ کی بالکونی میں کھڑے ہو کر وہ صرف محبت کی شاعری نہیں سنتا بلکہ نوجوان نسل کی امیدیں، سماجی حدود اور روایتیں، مغربی معاشرت کے نئے رجحانات، آزاد خیالی کو بھی محسوس کیا۔

مصنف لکھتے ہیں:

> ''ہم نے دیکھا مکان کے سامنے کافی تعداد میں ماڈرن رومیو اور جولیٹ ایک دوسرے سے چمٹے سسکیاں لیتے بدمست ہو کر عشق کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترے ہوئے تھے۔ کچھ رومیو جولیٹ ہاؤس کے مین گیٹ اور در و دیوار پر اپنی زبان میں اپنی دلی مرادیں پوری ہونے کی دعائیں لکھنے میں مصروف تھے۔''[1]

آئس مین کے دیس (بولزینو) میں آئس مین میوزیم کا مشاہدہ اور لباس کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ کس طرح قدیم تہذیب کی شناخت موجودہ زمانے میں محفوظ کی گئی ہے۔ جھیل گاردا کی سیر میں قدرتی مناظر، جھیل کا شفاف پانی اور کنارے کے چھوٹے قصبے انسان کو ایک نئے فطری تجربے سے روشناس کرواتے ہیں۔ وینس کے گرینڈ کنال، مارکو چوک، آہوں والا پل اور نیڈو جزیرہ کی تفصیل

سے شہر کے تاریخی اور ثقافتی ورثے کی جھلک نظر آتی ہے۔ فلورنس میں مائیکل اینجلو کی زندگی اور آثار، ٹیسکنی اور کینٹی کی جمالیاتی حسن کی تفصیل اور گھڑ دوڑ کی روایات نے یورپ کی تاریخی تہذیب کو قریب سے دکھایا۔ ویٹیکن سٹی میں پاپائی روایات اور ایک موچی زادہ کے پوپ بننے کی داستان کے ذریعے یعقوب نظامی نے مذہب میں طاقت اور مقدس منصب کے اثرات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔

انتخاب کے طریقہ کار کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''نئے پوپ کے انتخاب کے لیے کارڈنل کا اجلاس ویٹی کن میں ہوتا ہے ،جب تمام کارڈنل جمع ہو جاتے ہیں تو ان کا بیرون دنیا سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔وہ کسی کے ساتھ اس وقت تک رابطہ نہیں کر سکتے جب تک نیاپوپ منتخب نہیں ہو جاتا۔ انتخاب کے بعد الیکشن کمشنر کھڑکی میں کھڑا ہو کر پکارتا ہے ''ہابی مس پایم'' Habemus Papemیعنی ہمارا پوپ ہے۔اس کے بعد نیاپوپ کھڑکی کے پاس نمودار ہو کر اپنا دیدار کروانے کے ساتھ ساتھ اہل روم اور سب کو دعاء دیتا ہے۔''[2]

ویٹیکن میوزیم، سینٹ پیٹر باسیلیکا اور مسیحی عدالتوں کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح مذہب کے نام پر بعض اوقات ظلم وستم روا رکھا گیا۔تاریخ کے اوراق میں جھانکیں تو ویٹیکن صرف ایک عبادت گاہ نہیں بلکہ اقتدار، علم اور کبھی کبھی بدعنوانی کا مرکز بھی رہا ہے۔ مذہب کے نام پر ظلم کا آغاز ویٹی کن سے شروع ہوا۔ باغی عیسائیوں یا عیسائی نظریات سے منحرف ہونے والوں کو عبرت ناک سزائیں دی جاتی تھیں۔

''زندہ آگ میں جلانے کے علاوہ سزائے موت بھی دی جاتی تھی۔ سزائے موت مختلف طریقوں سے دی جاتی تھی۔ سر قلم کرنا، پھانسی چڑھانا، صلیب پر لٹکانا یا پھر جدید طریقوں سے انسانوں کو ایک ایسے شکنجے میں کستے رہنا جس سے مجرم کی ہڈیاں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں اور مجرم بے گناہی اور دردناک موت کی فریاد لے کر اپنے خالق حقیقی سے جاملتا۔''[3]

اس کے ساتھ ساتھ ویٹیکن لائبریری کے مشاہدات سے علمی اور تحقیقی پہلو سامنے آتے ہیں۔ روم کے آثار قدیمہ، کلاسیوم اور جدید شہر کا امتزاج انسانی زندگی اور تاریخی تحفظات کے درمیان تعلق واضح ہوتا ہے۔

قدیم پومپیائی کے کھنڈرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پومپیائی شہر میں عیاشی، بدکاری عروج پر تھی۔ جگہ جگہ قحبہ خانے موجود تھے۔ جن کی دیواروں پر جنسی عوامل کے مناظر کی بڑی بڑی تصاویر موجود تھیں جنہیں دیکھ کر مصنف کو ہندوؤں کی شُہرہ آفاق جنسی کتابوں '' کاماسوترا''اور '' کوک شاستر ''کا خیال آیا کہ اہل ہند نے ان کا خاکہ رومنوں سے لیا ہوگا۔

جدید پومپیائی شہر کی عالی شان عمارتیں، عبادت خانے، کھیل کے اسٹیڈیم، کاروباری سینٹر، دکانیں، ہوٹل، ملیں دیکھنے اور اس شہر کی سڑکیں، گلیاں اور کھنڈرات میں گھوم پھر کر زمانہ قدیم کی تصاویر اور تحریریں پڑھ کر مصنف نے سوچا کہ رومن جن کی یادگاریں ہم دیکھ رہے ہیں ایک زمانے میں ان کی دہشت، ظلم و بربریت کے ڈنکے بجتے تھے۔ یہ حکمران خود کو دنیا کے وارث سمجھتے تھے لیکن آج دنیا میں عبرت کا نشان ہیں۔ سورت الحج کی آیت نمبر 44 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''کتنی ہی خطاکار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر اُلٹی پڑی ہیں۔ کتنے ہی کنویں بیکار اور کتنے ہی قصور کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔''[4]

مقامی لوگوں کی سادہ زندگی نے انسانی معاشرت میں اخلاق اور معاشرتی رویوں کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ نیپلز کا شہر، قلعہ، ماسانیلو کی تحریک اور پیزا کے جنم کی جگہ کا مشاہدہ ثقافتی اور تاریخی مطالعے کے لیے اہم ہے، جبکہ پیسا کا جھکا ہوا مینار اور ڈومیو چرچ نے فن تعمیر کی تاریخ کے اثرات کو واضح کیا۔

شہروں کے علاوہ مصنف نے اٹلی کے دیہاتی علاقوں کی بھی سیر کی۔ فیوجی گاؤں اور ویسپا کی کہانی نے یورپی دیہی زندگی کی تفصیل فراہم کی۔ یہ علاقے انہیں اپنے وطن جیسے نظر آئے۔ جہاں مردوں کے ساتھ خواتین اور بچے بھی کام کر رہے تھے۔ مصنف نے اطالوی دیہی زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ کھیتوں کے بیچ اطالوی مرد و خواتین کام میں مصروف تھے۔ اہل روما کو بیل کی جگہ گھوڑوں سے ہل جوتتے دیکھا جو کہ مصنف کے لیے انوکھی بات تھی۔ ندی میں بچوں کو نہاتے اور گائے بھینسوں کو جگالی کرتے دیکھ کر نظامی کو اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ اطالوی دیہاتوں میں سفر کرتے مصنف کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرپور سے ڈوڈیال کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''وطن عزیز کی طرح نیلے پیلے اور شوخ رنگوں کی کوٹھیاں دیکھیں۔ اٹلی کے رنگ برنگے مکان دیکھنے سے قبل میرا یہ خیال تھا کہ شوخ رنگ پاکستان کے دیہاتی لوگ پسند کرتے ہیں۔ لیکن آج اطالوی مکان دیکھ کر میری رائے بدلی کہ ایسے رنگ تو اٹلی جیسے امیر ملک کے دیہاتوں بلکہ شہروں میں بھی کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں۔''[5]

میلان سے پیرس کا سفر فرانس کے تاریخی اور ثقافتی مطالعے کی طرف لے جاتا ہے۔ جہاں پیرس کے مضافات، اخلاقی رویے اور معاشرتی حدود پر مشاہدات کیے گئے۔ فرانس یورپ کے مغربی حصے میں واقع ایک عظیم اور تاریخی ملک ہے۔ جس کی تہذیبی، فکری اور سیاسی ترقی نے نہ صرف یورپ بلکہ دنیا بھر پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ رومانی قبائل سے لے کر رومن سلطنت کا حصہ بننے تک اور قرونِ وسطیٰ کی بادشاہتوں سے جدید جمہوریہ تک فرانس نے مسلسل سیاسی، ثقافتی اور فکری ارتقاء کے مراحل طے کیے۔ کیتھولک چرچ کی طاقت، بادشاہت کا استبداد اور اشرافیہ کا عروج، تینوں نے ایک ایسے سماجی نظام کی تشکیل کی۔ جس میں عام انسان غلامی، فقر اور بے بسی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ یہی تضادات بالآخر ایک عظیم سماجی و سیاسی دھماکے کا پیش خیمہ بنے جسے تاریخ "انقلابِ فرانس" کے نام سے یاد کرتی ہے۔

انقلابِ فرانس کے حوالے سے مصنف تفصیل سے لکھتے ہیں:

> ''انقلاب فرانس کے وقت سب سے بڑا مسئلہ خوراک کا تھا۔ پیرس میں کام کرنے والے محنت کش اپنی آمدن کا 97 فیصد خوراک پر صرف کر دیتے تھے۔ پھر بادشاہ نے غلہ کی نقل مکانی پر بھاری ٹیکس لگائے ہوئے تھے۔ حکومتی اخراجات تمام کے تمام غریب محنت کشوں کے ذمے تھے۔ اس دوران امریکہ کی خانہ جنگی میں فرانس بھی اُلجھ گیا جس کی وجہ سے ملک بری طرح قرضوں میں پھنس چکا تھا۔ اس قرض کا بوجھ بھی محنت کش طبقہ کے سر آن پڑا۔ یوں فرانس کا محنت کش طبقہ بری طرح غربت میں پھنسا ہوا تھا۔ فرانس کے یہی غریب اُٹھے اور انہوں نے شاہی خاندان، جاگیرداروں اور کلیسا کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ بادشاہ کو پھانسی پر لٹکایا۔ یوں ایک ایسا انقلاب برپا ہوا جسے دنیا انقلاب فرانس کے نام سے جانتی ہے۔''[6]

مصنف نے انقلاب فرانس سے پہلے کے حالات کا موازنہ پاکستان کے آج کل کے حالات سے کیا ہے۔ جہاں مزدور، جاگیردار کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سندھ میں جاگیرداری نظام کی جڑیں بوہڑ کی مانند کافی گہری اور دور دراز تک پھیلی ہوئی ہیں۔

پگال پیرس کا وہ علاقہ ہے۔ جہاں سرخ بتیوں کی جگمگاہٹ اور جنسی آزادی کی فضا صدیوں سے یورپ کے تہذیبی اور اخلاقی تضادات کو بے نقاب کرتی چلی آئی ہے۔ یہاں کی گلیاں اگرچہ رنگین ہیں مگر ان میں چھپے کئی اندھیرے سوالات ہیں۔ جو ہر سنجیدہ انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پیرس کے ریڈ لائٹ ایریا میں عورتوں کو انتہائی معمولی قیمت پر اپنے جسم کا کاروبار کرتے دیکھ کر مصنف کو شدید دکھ ہوا۔

بیلجیم یورپ کی اس زمین کا نام ہے جہاں تاریخ، فن اور تہذیب ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ یہاں کی فضائیں قرونِ وسطیٰ کے گرجاگھروں کی گھنٹیوں سے گونجتی رہی ہیں اور پتھریلی گلیوں میں صدیوں پرانے بازاروں کی خوشبو آج بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ گرینڈ پیلس برسلز جیسے چوک جہاں کبھی شاہی اعلانات ہوا کرتے تھے آج بھی ماضی کی بازگشت سناتے ہیں۔ گوتھک طرزِ تعمیر میں ڈھلی عمارتیں، عظیم الشان کلیسا اور فنِ تعمیر کے نادر نمونے بیلجیم کو صرف ایک ملک نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی تاریخ بنا دیتے ہیں۔

برسلز میں داخل ہو کر علاقہ کی خستہ حالت دیکھ کر مصنف کو کافی مایوسی ہوئی تھی لیکن جب گھوم پھر کر شہر کو دیکھا تو یہ شہر کافی ترقی یافتہ اور تاریخی ورثہ سے مالا مال ہے۔ یہ صرف بیلجیم کا دارالحکومت ہی نہیں بلکہ ایک یورپی دارالحکومت بھی ہے۔ کیوں کہ یورپی یونین، نیٹو اور دیگر کئی بین الاقوامی تنظیموں کے صدر دفاتر یہاں موجود ہیں۔ یہاں کی گلیاں، زبانیں، ثقافتیں اور ذائقے بین الاقوامی ہم آہنگی اور تنوع کی خوبصورت مثال ہیں۔ فرانسیسی، ولندیزی اور جرمن زبانیں یہاں ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتی ہیں جبکہ انگریزی بھی بخوبی سمجھی جاتی ہے جو اس کی بین الاقوامی حیثیت کو اور مستحکم کرتی ہے۔

جرمنی یورپ کا ایک اہم اور مرکزی ملک ہے جو اپنی تاریخی گہرائی، فکری روایت، سائنسی ترقی اور ثقافتی تنوع کے باعث دنیا بھر میں پہچانا جاتا ہے۔ اس کی سرزمین ایک ایسے خطے پر واقع ہے جہاں ماضی کی بڑی بڑی سلطنتیں، جنگیں، سیاسی تحریکیں اور فکری انقلابات برپا ہوئے۔ جرمنی کی تاریخ رومی سلطنت کے زمانے سے جا ملتی ہے جب اس خطے کو Germania کہا جاتا تھا اور یہاں مختلف قبائل آباد تھے، جنہوں نے رومی طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ بعد ازاں قرونِ وسطیٰ میں یہی جرمنی مقدس رومی سلطنت کا حصہ بن کر وسطی یورپ کا سیاسی و مذہبی مرکز بن گیا۔ اس دور میں شہروں، قلعوں، اور مذہبی عمارات کی تعمیر نے نہ صرف جرمن معاشرت کو مضبوط کیا بلکہ فنِ تعمیر، مصوری اور دانشوری کے کئی نئے رجحانات کو جنم دیا۔ اسی پس منظر میں جب ہم جرمنی کے مختلف شہروں کی بات کرتے ہیں، تو ہر شہر اپنے اندر ایک الگ تاریخ، ایک منفرد مزاج، اور مخصوص علمی و تہذیبی فضا رکھتا ہے۔

یورپ میں اقتصادی، ثقافتی اور تاریخی لحاظ سے فرینکفرٹ نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد فرینکفرٹ بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ یہ جرمن قوم کی ہمت ہے کہ کھنڈرات میں بدلے اس شہر کو اس مقام پر پہنچایا کہ آج فرینکفرٹ جرمنی کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ جرمن قوم کی اس ہمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''خوبصورت عمارتیں، سڑکیں پارک دیکھ کر میں سوچنے لگا۔ کتنی عظیم قوم ہے جرمن، جس نے جنگ عظیم اول اور دوم کی تباہ کاریوں کے باوجود صرف پچاس سال کی قلیل مدت میں ملک کو پھر سے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔''[7]

ماسٹرخ، کولن اور بون کے تاریخی مقامات، ڈوزل ڈف اور قلعے اور پہاڑیاں اور ہائڈل برگ کے قلعہ اور یونیورسٹی کی جھلک نے جرمنی کی تہذیبی اور ثقافتی حیثیت واضح کی۔ ہائیڈل برگ کی سب سے نمایاں شناخت اس کی عظیم جامعہ، یونیورسٹی آف ہائیڈل برگ ہے۔ جس کی بنیاد 1386ء میں رکھی گئی۔ یہ جرمنی کی سب سے قدیم یونیورسٹی کہلاتی ہے۔ اس یونیورسٹی کا شمار اس وقت دنیا کی صف اول کی یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی لائبریری میں بڑے قدیم اور نادر نسخے موجود ہیں۔ علامہ اقبال بھی اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کے دوران تحقیق کی غرض سے ہائیڈل برگ کے اس کتب خانے میں تشریف لائے تھے۔ یونیورسٹی کے خوبصورت راستوں پر پروفیسر حضرات اور اہل علم چہل قدمی کیا کرتے تھے

۔علامہ اقبال نے بھی اس چہل قدمی کے دوران دریائے نیکر سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی۔ جو بانگ درا میں ''ایک شام'' کے نام سے موجود ہے۔ دریائے نیکر کے ساتھ پھیلے ہوئے سبز پہاڑ، پرانا قلعہ، پتھریلی گلیاں اور سرخ پتھر سے بنی تاریخی عمارات اس شہر کو ایک خوابناک منظر عطاء کرتے ہیں۔

عارف محمود کسانا لکھتے ہیں:

''پہاڑوں کے درمیان دریا اور اس کے دونوں طرف پھیلی ہوئی خوبصورت وادی بہت حسین منظر پیش کرتی ہے۔ ہائیڈل برگ کی فضا بہت صاف ہے اور غالباً یہ جرمنی کا واحد شہر ہے جہاں صنعتیں نہیں۔ اس لیے فضائی آلودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دریائے نیکر کی خاموش روانی دیکھ کر ذہن علامہ کہ نظم "ایک شام" کی طرف چلا جاتا ہے جو انہوں نے اسی دریا کے لیے لکھی۔ یہ نیکر کا سحر تھا جس نے علامہ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے''[8]

دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے سوئزرلینڈ خوابوں کی ایک سرزمین کی حیثیت رکھتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اس سرزمین کے طول و عرض مبہوت کر دینے والی قدرتی خوبصورتی سے مزین ہیں۔ سوئزرلینڈ یورپ کے باقی ممالک سے تھوڑا منفرد اور بہتر ہے کیوں کہ اس میں وہ ساری باتیں تو ہیں ہی جو یورپ کے باقی ملکوں میں ہیں، مگر اس کی قدرتی خوبصورتی اسے باقی جگہوں سے ممتاز بناتی ہے۔

جنیوا شہر پہاڑوں کے دامن میں ایک بڑی جھیل کے کنارے آباد ہے۔ جنیوا قدیم اور جدید شہر پر مشتمل ہے۔ شہر جدید میں ٹرین اسٹیشن، بس اسٹیشن، ہوٹل، شاپنگ سینٹر اور دفاتر ہیں۔ جبکہ قدیم شہر میں تاریخی عمارات اور تنگ و تاریک گلیاں جنیوا کے ماضی کی آئینہ دار ہیں۔ جنیوا کا شہر جدید چند گلیوں اور بازار پر مشتمل ہے جسے تھوڑی ہی دیر میں چھان مارا۔

جنیوا شہر سے ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر ورلڈ اینڈ ٹریڈ آرگنائزیشن ،انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن، وائی ایم سی اے، انٹرنیشنل المپک کمیٹی اور ریڈ کراس کے دفاتر ہیں۔ ترقی کے لحاظ سے یہ دنیا کے شہروں کی صف اول میں ہے۔ قدیم جنیوا میں مصنف نے اس مکان کی بھی سیاحت کی۔ جہاں سے موجودہ بینکوں کا آغاز ہوا، بینکوں کے آغاز کے بارے میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

''بینکوں کی تشکیل میں مذہب ایک بڑی رکاوٹ تھی، چونکہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں سودی کاروبار کی ممانعت ہے یہودی علماء نے اس کا یہ حل نکالا کہ سودی کاروبار سے ممانعت موسوی شریعت ہے، اس طرح یہودی کا یہودی سے سود لینا حرام ہے لیکن غیر یہودی جو شریعت موسوی کو نہیں مانتے، سے سود لینا جائز ہے۔ یوں یہودیوں نے سودی نظام کو شرعی لحاظ سے جائز قرار دے کر سودی کاروبار کا آغاز کیا۔''[9]

سوئس شناخت کے سب سے دلچسپ پہلوؤں میں سے ایک اس کا لسانی اور ثقافتی تنوع ہے۔ سوئزرلینڈ سرکاری طور پر ایک چار لسانی ملک ہے۔ جس میں جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور رومن سرکاری زبانیں ہیں۔ یہ لسانی تکثیریت سوئزرلینڈ کی ثقافتی پیچیدگی کی عکاس ہے۔ جہاں مختلف برادریاں صدیوں سے شانہ بشانہ رہ رہی ہیں۔ اپنی روایات اور رسم و رواج کو فروغ دے رہی ہیں بلکہ ایک مشترکہ قومی شناخت کی تعمیر میں بھی اپنا

حصہ ڈال رہی ہیں۔ ان مختلف لسانی اور ثقافتی شناختوں کو قومی تانے بانے میں شامل کرنا کنفیڈریشن سے تعلق کے مضبوط احساس کی بدولت ممکن ہوا۔ جس نے ان اختلافات کو ہم آہنگی کے ساتھ رہنے دیا۔

سوئزرلینڈ کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ایک چھوٹے سے ملک میں اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے چیلنجوں پر قابو پانے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس کی گہری جڑیں، ثقافتی تنوع، جمہوری روایات اور غیر جانبداری کا اصول وہ ستون ہیں جن پر جدید سوئزرلینڈ قائم ہے۔ سوئس زندگی کا ہر پہلو سیاسی اداروں سے لے کر ثقافت تک اس بھرپور تاریخی میراث کی عکاسی کرتا ہے۔ جو ملک کے حال اور مستقبل پر اثرانداز ہوتا رہتا ہے۔

جنیوا شہر کے بارے میں مصنف کا خیال تھا یہ بہت خوبصورت ہوگا لیکن یہاں آ کر جنیوا کی سیاحت سے مایوسی ہوئی۔ بچپن کے حسین خواب ریزہ ریزہ ہوئے۔ ذہن میں جنیوا کا جو حسین تصور تھا وہ حقیقت میں چکنا چور ہوا۔ سوئزرلینڈ کی سیاحت کے بعد مصنف اس بات کے حامی ہیں کہ کشمیر برصغیر کا سوئزرلینڈ ہے۔ سوئزرلینڈ کے حسین مناظر انہیں اپنے وطن کی یاد دلاتے ہیں۔ ایک ترقی یافتہ ملک کو کشمیر کے مقابل پاکر مصنف خوش ہوتا ہے لیکن پھر انہیں خیال آتا ہے کہ سوئزرلینڈ کے باسی تو آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں جبکہ کشمیری صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

معاشرت انسان کی سماجی زندگی کا وہ نظام ہے جس میں روایت، اخلاق، معاشی ڈھانچہ، خاندانی اصول اور فکری رویے مل کر ایک مشترکہ نظم پیدا کرتے ہیں۔ یورپ کی معاشرت اس طویل تاریخی سفر کی مثال ہے جو صدیوں کے سیاسی انقلابات، فکری بیداری، مذہبی تحریکوں، صنعتی ترقی اور سائنسی پیش رفت کے نتیجے میں تشکیل پایا۔ یورپی معاشرے میں قانون کی پابندی، شہری شعور، فرد کی آزادی، کام کی قدر، وقت کی اہمیت اور علم دوستی کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ جس نے اسے دنیا کی ترقی یافتہ تہذیبوں میں شمار کروایا۔ لیکن اس ترقی کے ساتھ ساتھ یورپ نے سماجی سطح پر وہ تبدیلیاں بھی دیکھیں جنہوں نے اس کے اخلاقی ڈھانچے کو مختلف سمتوں میں موڑا۔ فرد کو بے حد آزادی دینے کے نتیجے میں خاندانی نظام کمزور ہوا۔ مذہبی قدریں پس منظر میں چلی گئیں اور جدیدیت کے نام پر عریانی اور جنسی بے راہ روی عام ہونے لگی۔ آرٹ، میڈیا اور تفریحی صنعت نے اس رجحان کو مزید پھیلایا اور معاشرتی زندگی میں وہ پہلو پیدا کر دیئے جو مشرقی معاشروں کے لیے قابل قبول نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود یورپی معاشرہ ایک مضبوط انتظامی اور شہری نظم رکھتا ہے، جہاں قانون کی گرفت اور اجتماعی ذمہ داری کا احساس انہیں بکھرنے نہیں دیتا۔ یوں یورپ کی معاشرت ایک ایسے دوہرے رنگ کی مثال بن گئی ہے جہاں ترقی اور زوال، علم اور خواہش، آزادی اور بے راہ روی ایک ساتھ چلتے ہیں اور ایک ایسا پیچیدہ سماجی نقشہ بناتے ہیں جو نہ صرف مطالعے کے قابل ہے بلکہ انسان کو تہذیب اور اخلاق دونوں کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

یورپی ممالک کے بارے میں بات کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ انہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کر لی ہے جس کی وجہ سے یہ دنیا کے دیگر خطوں کے لیے قابل دید مثال بن چکے ہیں لیکن ان میں خامی بھی ہے۔ وہ خامی ہے جنسی آزادی اور بے راہ روی۔ یہ خامی اب مغربی معاشرے اور تہذیب کا اس قدر پختہ حصہ بن چکی ہے کہ پادری اور کلیسا بھی اس کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔ مصنف یورپ کی عریاں تہذیب اور جنسی بے راہ روی پر کف افسوس ملتے ہیں۔ یورپ میں جسمانی اعضاء کی نمائش کا چلن عام ہے۔ مصنف کو یہ چلن سخت ناگوار گزرا۔ انہیں یورپی ممالک خصوصاً فرانس میں ایسے حیا سوز مناظر دیکھنے کو ملے جنہیں دیکھ کر کراہت محسوس ہوئی۔ سوئٹزرلینڈ کی سرحد کے نزدیک فرانسیسی علاقہ مل ہاؤس میں انہوں نے مرد و خواتین کو جھیل کنارے بالکل برہنہ دیکھا۔ نسل آدم کو فطرتی لباس میں دیکھ کر مصنف کو ان لوگوں سے نفرت ہونے لگی، فرانس کی اس ننگی مخلوق کو دیکھ کر احساس ہوا کہ لباس انسان کی زینت ہے۔ جس سے انسان اپنے جسم کے پوشیدہ حصوں اور بے ڈھنگے اُبھاروں کو چھپاتے ہیں۔

''میں حقوق نسواں کا بڑا حمایتی ہوں، میں چاہتا ہوں کہ خواتین کو بھی مردوں کے برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ لیکن آج کی مغربی خواتین کو آزادی نسواں کا جو مذاق اُڑاتے دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مغربی خواتین آزادی حاصل کر کے آگے بڑھنے کی بجائے ترقی معکوس کی طرف چلی گئی ہیں۔ وہی مقام جس سے ہماری تہذیب کا آغاز ہوا۔''[10]

ترقی کے نام پر عورت اپنے بلند مقام سے بھی گر چکی ہے۔ یورپی ممالک میں خواتین کی اس بے قدری اور ذلت کو دیکھ کر مصنف کو شدید دکھ پہنچا۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے یعقوب نظامی نے خواتین کے حق کی علمبردار نام نہاد تنظیموں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جن کا طرز عمل منافقت سے لبریز ہوتا ہے۔ جنہیں نیا کے باقی ممالک کی عورتیں تو مظلوم نظر آتی ہیں لیکن ترقی یافتہ یورپ کی بے بس خواتین دکھائی نہیں دیتیں، جو پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر معمولی قیمت پر خود کو فروخت کر دیتی ہیں۔

اس سفر نامے کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کے ممالک میں تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی پہلوؤں کی پیچیدگی موجود ہے۔ ہر شہر اپنے فن تعمیر، بازار، میوزیم اور قدرتی مناظر کے ذریعے ثقافتی شناخت کا حامل ہے۔ یعقوب نظامی کے مشاہدات نے یہ واضح کیا کہ انسانی معاشرت میں اخلاق، عدل اور سماجی تعلقات کی اہمیت کس قدر ہے۔ قرآن مجید کے حوالے، جیسے عدل وانصاف اور معاشرتی ذمہ داری کے اصول، یورپی معاشرت کے مشاہدے میں رنگ بھرتے ہیں اور انسانی رویوں کو سمجھنے میں رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

یعقوب نظامی نے اپنے سفر نامے میں مختلف یورپی ممالک کے تاریخی، سیاسی اور معاشی حالات کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔ یہ سفر نامہ واقعات ومشاہدات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ مصنف کے ذاتی تاثرات اور احساسات کا آئینہ دار بھی ہے ۔یورپی ممالک کی ترقی اور کامیابیوں کو بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کی ایک کوشش بھی ہے کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام واپس حاصل کر سکیں۔

سفر نامہ میں مصنف کا انداز بیاں سادہ مگر دلچسپ ہے۔ بر محل اشعار، محاورات کا استعمال اور دوستوں سے چھیڑ چھاڑ سفر نامے میں دلچسپی کا باعث ہے۔ واقعات کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری نہ چاہتے ہوئے دل چسپی لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یعقوب نظامی کے انداز بیان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسے لفظی تصویر کے ذریعے پیش کرتے ہیں، اس طرح قاری سفر نامہ پڑھتے ہوئے خود کو مصنف کے سنگ محسوس کرتا ہے۔

حوالہ جات

1 یعقوب نظامی، **یورپ یورپ ہے**،(لاہور:الفیصل ناشران،2012ء)،ص46-

2 ایضاً،ص112-

3 ایضاً،ص124-

4 سورۃ الحج22:44-

5 یعقوب نظامی، **یورپ یورپ ہے**،(لاہور:الفیصل ناشران2012ء)،ص39-

6 ایضاً،ص213-

7 ایضاً،ص234-

8 عارف محمود کسانا، **ہائیڈل برگ شہر خوبصورت خواب**،(ایکسپریس نیوز،26جون2018ء)

9 یعقوب نظامی، **یورپ یورپ ہے**،(لاہور:الفیصل ناشران2012ء)،ص276-

10 ایضاً،ص267-